Journal of Religion & Society **(JR&S)**
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296Online ISSN: 3006-130X
Platform & Workflow by: Open Journal Systems
https://doi.org/10.5281/zenodo.21698889

The Art of Inshaiya (Essay) Writing In Urdu Literature (An Analytical Study)

اردو ادب میں انشائیہ نگاری کا فن (تجزیاتی مطالعہ)

Memuna Sadaf
PhD Scholar, Department of Urdu, University of Karachi, Karachi.
Correspondance Author: memunasadaf1@gmail.com

ABSTRACT

Etymologically, the term "Inshaiya" means "expression" or "utterance." It is considered a relatively new genre of prose literature, bearing some resemblance to the essay (maqala/muhawala), yet possessing its own distinct identity separate from it.In an Inshaiya, the writer presents glimpses of his personality quite freely in his writings.The essay is that delightful genre of prose literature in which the writer presents his personal impressions, emotions, and imagination in a lively, informal, and free manner. In it, style takes precedence over information or philosophy.Technically, an essay is defined as a piece of writing in which any significant or insignificant event, any idea, any sentiment, or any fleeting mood is presented in an enjoyable manner. Or, an essay is that form of writing in which the author conveys his personal experiences or impressions in an interesting, witty, and unique style, and expresses the matters of the heart with .At first glance, it is a rather difficult task to define the limits of an essay, because not only have there been several revolutionary changes in the meaning and form of the essay from a historical perspective, but every essay also possesses a distinct quality both in terms of content and technique.Historically, there is such a marked divergence between the methods of Bacon, Lamb, and Chesterton that one feels considerable hesitation in including the essays written by them under the same category.

Key Words: *Art, Essay, Urdu Literature, Bacon, Lamb, Techniques, Essay Writing, Clasical Perspective, Literature, Prose, Inshaiya.*

انشائیہ کو لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے معنی "عبارت" کے ہیں۔ یہ نثری ادب کی ایک نو مولود صنف تصوّر کی جاتی ہے جو کسی حد تک مضمون سے مشابہ ہوتی ہے مگر مضموں سے الگ ایک اپنی منفرد پہچان رکھتی ہے۔ انشائیے میں ادیب اپنی تحریروں میں بالکل آزادانہ طور پر اپنی شخصیّت کی جھلک پیش کرتا ہے، یا دیگر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انشائیہ اردو ادب کی وہ نثری صنف ہے جس میں قلم کار کسی خاص موضوع یا عنوان کا پابند نہیں ہوتا، اسے کسی مخصوص ابتدائیے کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ وہ کسی عالمانہ گفتگو کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے اور نہ کسی مفکرانہ اختتام کا اہتمام کرتا ہے وہ صرف اپنی ذات کے کسی پوشیدہ گوشے کو نہایت لطیف اور خوشگوار اندازِ بیان میں رقم کرتا ہے۔ اس تحریر کی دل کشی اس کا اختصار اور جامعیت ہوتی ہے۔ اور دل فریب بات تو یہ ہے کہ بات کو کسی بھی مخصوص نتیجے پر نہیں پہنچاتا اس کا ادراک قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔

انشائیہ نگاری کی ابتداء کے بارے میں اردو ادب کے محققین و مؤرخین میں اختلافِ رائے دکھائی دیتا ہے مطلب یہ کہ اس صنف کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟ انشائیہ کب وجود میں آیا؟ یہ کس زبانِ ادب سے اردو میں وارد ہوا؟ انشائیہ کا اوّلین نمونہ کون سا قرار پایا؟ اردو ادب کا پہلا انشائیہ نگار کون تھا؟ اور ایسے کئی سوالات ہیں جو ادب کے قاری کو جھنجھوڑتے ہیں مگر تاریخ دان اب تک تذبذب کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ ادبی تاریخ نگاری کا جائزہ لیا جائے تو متعدد راز فشا ہوتے ہیں کوئی محقق ملّا وجہی کو اوّلین انشائیہ نگار مانتا ہے، کوئی سر سید احمد خان کو، اور کوئی سجاد حیدر یلدرم کو پہلا انشائیہ نگار تسلیم کرتا ہے۔ بلاشبہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ملا وجہی کی کتاب "سب رس" میں کئی ایک مقام پر کچھ ایسے نمونے ضرور ملتے ہیں جن میں انشائیہ کا گمان ہوتا مگر اس قدر قلیل تعداد کی بنیاد پر انھیں انشائیہ نگار کہہ دینے میں اختلاف رکھتے ہیں ملّا وجہی کی کتاب "سب رس" میں انشائیے کے اوّلین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جسے انہوں نے غیر شعوری طور پر اپنایا ہے۔ لیکن اسے پوری طرح انشائیہ نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ نقّاد

سر سیّد احمد خان کو اس صنف کا موجد قرار دیتے ہیں جن میں سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر وحید قریشی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد ذکریا، پروفیسر جمیل آزر، پروفیسر نظیر صدیقی اور ڈاکٹر سلیم اختر شامل ہے، یہ لوگ سر سیّد کو ایک باقاعدہ انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"سر سید پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی ایسے (ESSAY) کی بدیسی صنف کی قلم کو گلشن اردو میں لگایا، انہوں نے انگریزی "ایسے" کا مطالعہ کر رکھا تھا وہ اس کے مزاج داں بھی تھے۔ انہوں نے طبع زاد لکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی "ایسے" کے تراجم بھی کیے۔ الغرض اس نئی صنف سے وابستہ فنی اور اسلوبیاتی امکانات دریافت کرنے کی مکمل سعی کی۔"۱

مضمون "انشائیہ کی کہانی" میں جمیل آذریوں رقم طراز ہیں:

"غیر ارادی طور پر ہی سہی مگر اس صنف کے کچھ بکھرے ہوئے نقوش تو ہمیں قدماء کے یہاں بھی دکھائی دیتے ہیں خاص طور پر غالب کے مکاتیب کے کچھ ٹکڑے، سر سیّد کے چند ایک مضامین، ابوالکلام آزاد کی "غبار خاطر" کے چند مضامین اور کرشن چندر کے ایک دو مضامین اس صنف کے ابتدائی نقوش کی نمائندگی تو بہر حال کرتے ہیں، اب ہم چاہ کر بھی انشائیہ کے ارتقا میں ان نمونوں کو نظر انداز تو نہیں کر سکتے لیکن اس نثری صنف انشائیہ کو اردو ادب میں بطور ایک منفرد صنف ڈاکٹر وزیر آغا نے متعارف کروایا۔"۲

انشائیہ انگریزی لفظ (ESSAY) کا ترجمہ سمجھا جاتا ہے مگر میری ناقص رائے کے مطابق اب یہ ترجمہ غلط ثابت ہو چکا ہے اب انشائیہ کا انفرادی تشخص بالکل علیحدہ ہو گیا ہے اس لیے اب انگریزی (ESSAY) کا اردو ترجمہ "مضمون" زیادہ بہتر ہے۔ مضمون اور انشائیہ میں بہت فرق ہو گیا ہے مثلاً سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ مضمون کسی ایک عنوان پر ہوتا ہے۔ مضمون نگار کو یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ موضوع کے علاوہ کسی اور چیز پر بات کر سکے دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ انشائیہ میں قلم کار کے ذاتی جذبات واحساسات کا ذکر ہوتا ہے وہ ہمیشہ اپنے بطون کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے خیالات کا، اپنے جذبات کا، اپنے احساسات کا، اپنے تاثرات کا، اپنے شعور ولا شعور کا۔ اسی لیے انشائیہ تحریر احساساتی زیادہ اور تجرباتی کم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ خود کو کسی خاص موضوع یا عنوان کا پابند نہیں کرپاتا اور وادی وادی گھومتا ہے۔ اگرچہ رسمی طور پر وہ اپنے مضمون کی شناخت کے لیے اس کو کسی عنوان سے موسوم ضرور کرتا ہے کیونکہ یہ بھی تو ضروری ہے۔ مضمون کا کوئی نہ کوئی نام تو ہونا چاہیے۔ لیکن متن میں نام کا ذکر کم اور بے نام چیزوں کا ذکر زیادہ آجاتا ہے۔ موضوع صرف مندرجات میں ایک تسلسل اور ربط قائم کرنے کے کام آتا ہے لیکن بعض انشائیے ایسے بھی لکھے گئے ہیں جن میں کوئی عنوان یا نام نہیں دیا گیا اور دنیا جہان کے خیالات، تاثرات اور جذبات کو صرف اپنے حوالے سے بیان کر دیا ایسے انشائیے عموماً صیغہ واحد متکلم میں لکھے جاتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک صاحب "محشرِ کمال" کا ایک مستقل عنوان قائم کر لیتے ہیں اور اس کے تحت مختلف اوقات میں خیالات واحساسات کو تحریر کرتے رہتے ہیں۔ انشائیہ کا تعلق مصنّف کی ذات، اس کی رائے، اس کے تجربات ومشاہدات سے ہوتا ہے۔ انشائیہ اس قدر ہلکا پھلکا ہوتا ہے کہ اس کا ابلاغ بھرپور ہوتا ہے۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار موضوع کے ایسے ایسے پہلوؤں کا انکشاف کرتا ہے جو عام طور پر مشاہدے سے اوجھل ہوتے ہیں۔ انشائیہ میں مصنّف اپنے مشاہدے اور تجربے بیان کرتے وقت کسی عنایت کا شکار نہیں ہوتا اور نہ استادانہ رویہ اختیار کرتا ہے انشائیہ میں نہ کوئی روایتی ابتدائیہ ہوتا ہے اور نہ کوئی منطقی انجام۔ اس کی ابتدا اور انتہا دونوں میں ایک لطافت سی محسوس ہوتی ہے جو خالص منطقی اور مقصدی تحاریر میں نہیں پائی جاتی۔

"انشائیہ ایسی تحریر ہے جو کسی منطق پر آکر رک نہیں جاتی وہ بہت آگے جانا چاہتی ہے اور جاتی بھی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم زندگی کی حقیقتوں کا حصول صرف منطق کے بل بوتے پر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ صداقت کے راستے میں منطق ہمیں ایک مخصوص مقام پر لا کر خود آگے چلنے سے انکار کر دیتی ہے۔ کسی ایک منزل کے بہت سے مناظر آپ کو ایک انشائیہ میں نظر آسکتے ہیں۔ شاید اس کا ایک ہزارواں حصہ بھی منطق میں نظر نہیں آسکتا اور یوں انشائیہ کی منطقی صورت خالی پھیکی منطق کی صورت سے کہیں بڑھ کر صداقت ساماں اور صداقت افروز ہوتی ہے۔"
۳

ڈاکٹر وزیر آغا نے (ESSAY) کے لیے انشائیے کا لفظ استعمال کیا اور اس صنف کے اصول اور اسلوب کے بارے میں لوگوں کی تفہیم کے لیے تحریک شروع کی تو اردو ادب میں بہت سے نام لیے جانے لگے اور روایتی مضمون نگاری یا انشاء پردازی کو انشائیہ کہہ کر پیش کیا جانے لگا۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ تحریریں چاہے وہ فکشن ہوں یا نان فکشن ان میں کہیں نہ کہیں انشائیے کا اسلوب تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انشائیہ اس وقت اپنے خاص رنگ کا مظاہرہ کرتا ہے جب انشائیہ نگار کا تخلیقی

شعور اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب لکھنے والا خود کو موضوع پر اس طور مرتکز کر لیتا ہے کہ موضوع کے اندر کا شگاف نظر آنے لگتا ہے اور لکھاری ایک جہانِ تازہ کی جھلک پانے میں کام یاب ہو جاتا ہے۔

"یوں تو کسی بھی صنفِ ادب میں قواعد وضوابط کی پیروی اڈعائیت کی حد تک کی جائے تو ایجاد معنی، جدّتِ فکر اور تخلیقی تجربات کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ لیکن یہ بھی ضروری ہی کہ صنف کے اوصاف سے اس طرح انحراف نہ کیا جائے کہ اس کی پہچان مٹ جائے۔ جدید لسانی فکر کے مطابق، بلکہ قدیم اصولِ شناخت کے مطابق جواب فلسفے اور نظام کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے، ہم ہر چیز کو دوسری چیزوں سے فرق کے طور پر پہچانتے ہیں ورنہ کسی لفظ میں جا اسم کے طور پر مستعمل ہوتا ہے کوئی ایسا جوہر نہیں ہوتا جس سے وہ پہچانا جا سکے۔ روشنی اس لیے روشنی ہے کہ وہ اندھیرا نہیں ہے، انشائیہ اس لیے انشائیہ ہے کہ وہ مضمون نہیں ہے، مقالہ نہیں ہے، طنزیہ نہیں، مزاحیہ نہیں ہے۔ ہاں! انشائیہ مسّرت بخش ضرور ہے اور اسے پڑھ کر قاری مسکراتا بھی ہے لیکن کبھی کبھی۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں انشائیہ لکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ذاتی تجربات ار مشاہدات سے پسند ناپسند اور طنز واکراہ کو بالکل ختم کر دینا مشکل ہے، لیکن ارادی کوشش سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔" ۴

انشائیے کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ اس کو لکھتے وقت آزادی کا جو ایک تصوّر ہمیشہ قائم رہتا ہے وہ لکھنے والے کو جہاں زیادہ لکھنے پر اکساتا ہے وہاں اس کی حسِ نقد کو زرا دبا دیتا ہے۔ یعنی وہ بزعم خویش یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب جو اس نے آزدی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور اس کے قلم میں جو آزادی کے تصوّر کے ساتھ اپنے ہی انداز کی روانی آگئی ہے۔ یہی سب کچھ ہے۔ اسپ قلم جو سرپٹ دوڑا چلا جارہا ہے تو اس کا ایک واضح مطلب یہ بھی ہے کہ وہ یعنی صاحب قلم لکھ بھی نہایت معیاری قسم کا رہا ہے۔ لیکن صنفِ انشائیہ کی اس آزادی اور اس شوخی کو آپ کچھ بھی کہیں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح لکھنے والے کا بنتا بگڑ تا خواہ کچھ نہ ہو اس کے لکھنے کی مشق ضرور ہو جاتی ہے۔ چناں چہ جب سے انشائیہ کا غلغلہ اور شور برپا ہوا ہے ہماری اردو زبان میں نثر لکھنے کی مشق نے خوب فروغ پایا ہے۔ لکھنے لکھانے کے فعل کو آپ لاکھ کچھ کہیں پھر بھی یہ کام اپنی جگہ ایک آبرو رکھتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اس تگ ودو کے عالم میں اگر لکھنے والا زرا ہمّت سے کام لے تو اچھی نثر بھی معرضِ وجود میں آسکتی ہے۔

"آج یہ نومولود صنف موضوعاتی، فنّی اور معنوی لحاظ سے وسعت پذیر ہے اور اس کی اب تک کی رفتار سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مستقبل اجلا اور تابناک ہے۔ یہ صنف نئے ابھرتے ہوئے ادیبوں کو اپنی طرف راغب کرنے میں کام یاب ہو رہی ہے اور یوں لگتا ہے کہ موجودہ صدی انشائیہ کے لئے مفید اور کار آمد ثابت ہو گی۔" ۵

انشائیوں کی دو اقسام رائج الوقت ہیں ایک وہ جس میں خیال و ابلاغ دونوں میں طنز و مزاح کی آمیزش کو لازم قرار دیا گیا ہے دوسری قسم وہ ہے جو شروع سے آخر تک سنجیدہ بلکہ فلسفیانہ خیالات واحساسات پر مبنی ہوتی ہے اس میں اظہار و ابلاغ بھی بھاری بھر کم اور سنجیدہ ہوتا ہے لیکن خیالات و تاثرات اپنی ذات کے حوالے سے زیادہ ہوتے ہیں یہاں یہ بات واضح رہے کہ اگر حوالہ ذاتی نہیں تو وہ مضمون یا مقالے کی صورت اختیار کر لے گا خالص انشائیہ نہیں رہے گا۔ انشائیے میں ذاتی احساس یا ذاتی کرب بھی ضروری ہے۔ اردو میں انشائیہ اندر سے کسی شاخ کی کونپل کی طرح نہیں پھوٹا بلکہ افسانے اور ناول کی طرح در آمدی مال ہے۔ یہ بھی انگریزوں کے دور میں انگریزوں سے مستعار لیا گیا ہے سر سیّد اور ان کے رفقائے کار کسی حد تک انگریزی ادب سے شناسائی حاصل کرنے میں کام یاب ہو گئے تھے۔ نواب وقار الملک اور حالی وغیرہ انھی لوگوں میں شامل ہیں۔ انھوں نے انگریزی مضامین سے متاثر ہو کر انشائیے لکھے۔ لیکن ان کے تمام انشائیے سنجیدہ قسم کے ہیں ان مین طنز یا مزاح کا گزر نہیں۔ البتہ نیاز فتح پوری اور عبد الماجد دریابادی کے انشائیوں میں مزاح بھی دکھائی دیتا ہے اور طنز بھی۔ حسن نظامی کے اکثر صحافتی مضامین ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے ایسے انشائیے ہیں جن میں معتدم اور گوارا طنز و مزاح موجود ہے اور ان کا معاملہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے سر سیّد اور حالی وغیرہ کی طرح انگریزی ادب سے متاثر ہو کر مضامین نہیں لکھے بلکہ یہ نقشہ ان کا خود ساختہ تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی کتاب "غبارِ خاطر" اگر چہ خطوط کے مجموعے کے عنوان سے شایع ہوئی مگر انھیں انشائیہ گردانا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کے مطابق:

"اسلوب کا ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ انشائیے میں طنز اور مزاح کی آمیزش کی جائے اس اسلوب سے تخلیق میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خود میرے اکثر انشائیوں میں طنز بھی پایا جاتا ہے اور مزاح بھی موجود ہے لیکن اس فراوانی کے ساتھ نہیں ہے کہ انشائیہ کا دم گھٹ جائے اور وہ دب کر رہ جائے۔" ٦

فنّی لحاظ سے پر کھا جائے تو انشائیہ کو معتبر اور پر وقار بنانے کے لیے دو ہی خصوصیات ضروری ہیں ایک اختصار اور دوسری اس کی جامعیت ایک انشائیہ نگار اپنے فن پارے کو جس قدر مختصر اور جامع انداز میں اپنی تمام تر محاسبانہ خوبیوں کے ساتھ تخلیق کرے گا اس کی تحریر اتنی ہی معتبر سمجھی جائے گی اور وقار پائے گی۔ کیونکہ الفاظ جس قدر فطری انداز کا لبادہ زیب تن کریں گے اتنا ہی اس کا براہِ راست اثر قاری پر تادیر قائم رہ سکے گا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

”انشائیہ کے اسلوب میں جو لچک ملتی ہے اسی وجہ سے دیگر اصناف کے اسالیب سے بھی بقدرِ ظرف فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن یہ دھیان رہے کہ نہایت سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذراسی بے احتیاطی یا فنّی چوک کے نتیجے میں انشائیہ کا اسلوب اس رس سے محروم ہو جائے گا جو اس کا جوہر سمجھا جاتا ہے اور جس کے بغیر انشائیہ محض ایک روکھا پھیکا اور ہلکا پھلکا نثر پارہ ہی بن کر رہ جائے گا۔“ ۷

”مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ نیا سیکھتے یا کوئی آگہی پاتے ہیں۔ ایک ایسا خیال یا مطالعہ جس سے معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ممکن ہو، جس سے ہماری شخصیت میں علم کی روشنی پھوٹ پڑے۔ لیکن انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم گشتہ شے پالیتے ہیں۔ ایسی شے جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے، ایسی شے جو ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔“ ۸

ایک خالص اور منضبط مقالوں اور انشائیوں میں بنیادی طور پر یہ تفریق پائی جاتی ہے کہ انشائیہ کسی بھی موضوع کو بالواسطہ ذاتی حوالے سے پیش کرتا۔ عدم تکمیلیت ہی انشائیہ کا حسن ہے جب کہ مضمون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ عدم تکمیلیت کو ایک سقم شمار کیا جاتا ہے۔

”محمّد حسین آزاد ("نیرنگ خیال")، سجاد انصاری، خواجہ حسن نظامی (الو، دست پناہ، آغوش مچھر میں ایک شب، جھینگر کا جنازہ اور گلاب تمھارا کیکر ہمارا وغیرہ)، مرزا فرحت اللہ بیگ ("پٹنا"، "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی"، دلی کا آخری یادگار مشاعرہ اور ایک وصیت کی تعمیل وغیرہ خاکے میں انشائیے کے رنگ صاف طور پر نظر آتے ہیں)، مولانا ابوالکلام آزاد، ملّا رموزی، رشید احمد صدیقی (ارہر کا کھیت، وکیل، گھاگ، دو ایسے گھاٹ اور چارپائی وغیرہ)، پطرس بخاری (ہاسٹل میں پڑھنا، لاہور کا جغرافیہ، کتے، سویرے جو کل میری آنکھ کھلی اور سینما کا عشق وغیرہ)، اسی طرح بہت سے اردو ادیب ہیں جنھوں نے انشائیہ نگاری کی روایت میں حصہ لیا اور روایت کو فروغ بخشا۔ اس سلسلے میں شوکت تھانوی، کرشن چندر، کنہیالال کپور، مجتبیٰ حسین، ابن انشا اور احمد جمال پاشا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ آج بھی کئی ادیب ہیں جو اس صنف کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔“ ۹

ان کلاسیکی ادب پاروں میں افسانے کا افسوں بھی ہوتا تھا، اسالیب کی بوقلمونی اور خیالات کی نیرنگی کا حسین و جمیل نمونہ بھی ہوا کرتے تھے نیز نصاب و موعظت کا مقصود و منشا رکھنے بلکہ نین السطور سے لے کر کھلے عام تک پند و نصیحت کا مرقّع ہونے کے باوجود ان کے انشائیے لطیف اور دل نشین و دل گداز ہوتے تھے۔ کلاسیکی انشائیے کی یہی کرشمہ سازی آج بھی دامنِ دل اپنی طرف کھینچتی ہے۔

”اردو ادب میں اب تک جتنے بھی انشائیے تحریر ہو چکے ہیں۔ ان کی انفرادیت نے ادب میں اس صنف کی قدر و قیمت بڑھائی ہی ہے۔ اس صنف کی اصل کامیابی ہی یہ ہے کہ اس کے تمام فنی و فکری عناصر کو داخلی و خارجی ہم آہنگیوں کے ساتھ تخلیق کیا جائے۔“ ۱۰

انشائیہ نگار کو اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی اس کے خیالات اور آراء سے کہاں تک اتفاق کرتا ہے اور کرتا بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ انشائیہ نگاری کی پہلی شرط تو یہی ہے کہ آپ میں اپنے تجربات و مشاہدات اور خیالات و احساسات کو بے باکی کے ساتھ ظاہر کرنے کی جرأت موجود ہو۔ اب یہ پھر ایک الگ سوال ہے کہ اس جرات کے باوجود عمدہ اور معیاری انشائیہ تخلیق نہ ہو سکے۔ بہر حال انشائیہ نگاری کا پہلا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ آپ جس بات کا اظہار کریں اس میں بے تکلّفی نمایاں ہو تکلّف کے ساتھ شاید دوسی اصنافِ سخن میں خامہ فرسائی کی جاسکتی ہو لیکن آپ ایک انشائیہ تکلّف کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ انشائیہ کا پہلا سبق ہی یہی ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف اپنی ذات سے بے تکلّف ہو جائیں بلکہ دوسروں کو بھی بے تکلف کر دیں۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ اعلیٰ قسم کے ادب کی بڑی پہچان یہ ہے آپ اونچی سے اونچی بات کو پڑھتے وقت اس طرح محسوس کریں کہ جیسے وہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ بے تکلفی کے ساتھ کے ساتھ کی گئی بات کا دل پر اثر ہوتا ہے جبکہ تکلف سے کہی گئی بات کو یقین کرنا تو بڑی بات ہے آدمی اس طرح اس کو اچھی طرح سننے کے لیے بھی تیّار نہیں ہوتا۔ جہاں انشائیہ اپنے لکھنے والے کو لکھنے کی مشق کراتا ہے وہیں پر انشائیہ اپنے پڑھنے والے کو پڑھنے کی عادت بھی ڈالتا ہے

انشائیے کے فن میں بہت لوگ نئے اضافوں اور نئی سوچوں کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں بہت سارے انشائیہ نگار ہیں جو اس صنف کی آبیاری، ترقی اور فروغ کے لئے تحریریں تخلیق کر رہے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں موجودہ دور میں اس صنف کے تحت لکھنے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کہا جا سکتا ہے اس صنف کی ترقّی کے قوّی امکانات دکھائی دے رہے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ آئندہ صدی انشائیے کی صدی کہلائے گی۔

حوالہ جات:۔

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد(لاہور:سنگِ میل پبلشرز)ص : ۱۷

۲۔ جمیل آزر، انشائیہ کی کہانی(ماہنامہ صریر:سال نامہ جون،جولائی1998)ص: ۵۲

۳۔ مشکور حسین یاد، ممکناتِ انشائیہ،(لاہور: کتاب نگر،1983)ص:۶۵

۴۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر ،حسرت کے شگوفے(کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۹۵)ص:۱۳

۵۔ مشکور حسین یاد، ممکناتِ انشائیہ،(لاہور: کتاب نگر،1983)ص:۶۳

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال(مکتبہ جامعہ نگر، نئی دہلی،)ص:۴۳

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد(لاہور:سنگِ میل پبلشرز)ص :۲۴۵

۸۔ سید محمد حسنین، ڈاکٹر، صنف انشائیہ اور انشائیے(لکھنو،1973)ص:۱۵

۹۔ مطیع الرحمٰن، ڈاکٹر،انشائیہ نگاری: تعریف، خصوصیات اور تاریخ(آنلائن اردو جرنل:اردو کائنات:شمارہ نمبر ۴،۱۹جون ۲۰۲۳)

۱۰۔ نوشین خان,انشائیہ کا فن(آنلائن اردو جرنل:اردو دنیا،شمارہ نمبر۰۶،جون ۲۰۲۳)